AL-IDAH
OPEN ACCESS
الإيضاح
Bi-Annual Research Journal
Published by
Shaykh Zayed Islamic Centre
University of Peshawar
www.al-idah.szic.pk
ISSN (Print) : 2075-0307
ISSN (Online) : 2664-3375
JUL - DEC 2019
VOL 37 : ISSUE 2

اردو میں عربی الفاظ کا املا

(اختلافی مباحث کا تجزیاتی مطالعہ)

A Critical Study of antithetical debate on Orthography of Arabic words in Urdu

Ibrar Khan

.Assistant professor, Govt. Post Graduate College, Nowshera

Abstract:

Arabic language and literature has influenced Urdu language and literature in terms of fonts, grammar as well as orthography .linguists have different opinions about orthography of Arabic words in Urdu. Some of them hold favorable opinion, some have opined against it, while some of the linguists have maintained a balance point of view in terms of orthography. The holy Qur'ān is Arabic and perhaps that is the reason Muslims have spiritual affinity with Arabic. But language also sacred the way religion is? Can we relate languages with religion? Moreover, sociolinguistics cannot be ignored and that linguists provides concrete notions based on based on scientific study of languages.in this article, the author has analyzed and discussed the contradictory debates of different academic and applied in Urdu orthography of Arabic words in Urdu.

Key words: *Influence of Arabic on Urdu, orthography of Arabic words in Urdu, language and religion, contradictory debates, analysis, recommendations.*

Scan for Download

CC BY

اردو پر عربی رسم الخط، قواعد واملا ودیگر اصنافِ نظم و نثر کے گہرے اثرات کا پرتو ملتا ہے۔ عربی زبان قرآن وحدیث کی نسبت سے مسلمانوں کے ہاں خصوصی تقدس اور قدر و منزلت کی حامل رہی ہے ،یہی وجہ ہے کہ اردو میں عربی طرز املا کی کافی حد تک پیروی ملتی رہی ہے۔ اردو میں عربی الفاظ کے املا کا تعلق دینی معاملہ ہے یا خالصتاً ایک لسانی مسئلہ ،اس حوالے سے علمائے لسانیات و املا میں اختلاف پایا جاتا ہے اور مختلف دلائل کی بنیاد پر اس کی تائید و تردید کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ مباحث واختلافات نظری بھی ہیں اور عملی بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ زبانوں میں فطری لحاظ سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور تحریر و تقریر کے حوالے سے نئے مباحث بھی سر اٹھاتے ہیں۔ لسانیات کی ترقی نے ان مباحث کو نئی سمتوں سے ہم کنار کر دیا ہے اور بہت سارے نظریات کو از سر نو غور و فکر سے گزارنے کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے۔ اردو املا کے نظری اصول و مباحث اور عملی طریقِ کار واسلوب کے حوالے سے ثقہ علما اور اداروں کے طریقِ املا کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمومی مسائل پر اتفاق کے ساتھ ساتھ اردو میں عربی الفاظ کے املا کے حوالے سے مختلف نظریات ملتے ہیں۔۔ اختلاف میں اتفاق کے پہلوؤں کی تلاش کے امکانات بہر حال موجود رہتے ہیں تاہم ان مباحث کا تجزیاتی مطالعہ ہم پر زبان ولسانیات کے بہت سارے افق وا کرتا ہے۔ اس حوالے سے بعض علمی، فکری اور عملی نکات رہنما ثابت ہو سکتے ہیں۔

بعض علمائے املا و قواعد کا خیال ہے کہ اردو زبان کے لیے عربی کی اہمیت مسلمہ ہے اور بہر حال اس کو طرزِ املا میں بھی عربی کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں پروفیسر غازی علم الدین قرآن کی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بے شک قرآن مجید ہم نے نازل کیا اور اس کی حفاظت بھی ہم کریں گے۔"[۱]

اس وعدۂ برحق کے مطابق جہاں قرآن قیامت تک محفوظ ہوگیا، وہاں عربی زبان اور اس کے قواعد بھی محفوظ ہوگئے۔ آج عرب دنیا میں کئی لہجے اور بولیاں موجود ہیں لیکن بنیادی اصول و قواعد اور املا کے ضوابط میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صحیح اردو لکھنے اور بولنے کے لیے اردو میں مستعمل عربی الفاظ کے تلفظ سے بہرہ ور ہونا بہت ضروری ہے۔ عربی زبان سے گہرے تعلق کے باوجود اردو دان غیر شعوری طور پر اکثر الفاظ کا تلفظ غلط کرتے ہیں۔[۲]

خواجہ غلام ربانی مجال کا خیال ہے کہ عام زبانوں کے الفاظ اور املا میں چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے غلط العام کو سند مان لینے کا اصول ہے البتہ عربی کاملاً اس کلیے سے مستثنیٰ ہے، وجہ نزولِ قرآن اور اللہ کی جانب سے حفاظتِ قرآن ہے۔[۳]

شوکت سبزواری کے مطابق مسلمانوں کی قومی زندگی میں عربی زبان و حروف کو وہی درجہ حاصل ہے جو یہود کی زندگی میں عبرانی زبان اور حروف کو حاصل ہے اور ہنود کی زندگی میں سنسکرت زبان اور دیوناگری حروف کو۔[۴]

ڈاکٹر ایس ایم (شیر محمد) زمان کے خیال میں نطق اور حرف کو ہم آہنگ کرتے ہوئے قرآنی املا کو برقرار رکھا جائے تاکہ کل ہمارے بچوں کو یہ الفاظ اجنبی نہ لگیں، اور ان کو اس کے تہذیبی، ادبی اور مذہبی پس منظر سے نہ کاٹا جائے۔....اردو املا کے مسائل ثقافتی، تہذیبی، لسانی ارتقا اور مذہبی نقطۂ نظر سے حل ہونے چاہیں۔.... عربی سے ہمارا تعلق روزمرہ کی زبان یا ادبی لسانیات تک محدود نہیں بلکہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے قرآن حکیم کے حوالے سے بھی عربی زبان ہمارے لیے مذہبی اور فکری پس منظر مہیا کرتی ہے۔[۵]

قرآنی الفاظ کے املا سے متعلق یہاں ایک اختلافی مسئلے کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔ رشید حسن خاں کا خیال تھا کہ: ''لفظ ''اللہ'' کی کتابت اردو میں ایک خاص طرح ہوتی ہے کہ دوسرے لام کی جگہ ایک شوشہ سا بنا دیا جاتا ہے۔ اس لفظ کی یہی رائج اور متعارف صورت ٹھیک ہے، اور اس کو اسی طرح لکھنا چاہیے۔''[۶]

حفیظ الرحمان واصف کا مؤقف تھا کہ نامہ ہائے مبارک کے اندر لفظ اللہ متعدد جگہ آیا ہے، اس کا املا دیکھیے! دو لام اور تیسرا ڈنڈا، جس کے ساتھ ہائے ہوز ہے، تینوں کی لمبائی اور اونچائی ایک برابر ہے۔ اس کا اصل املا وہی ہے جو پہلے سے موجود تھا، کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ لفظ اللہ کا اصل عربی املا جو پیغمبر ﷺ کی نظر انور کے سامنے لکھا گیا وہی اردو میں بھی رہنا چاہیے۔ نظمِ قرآن کی طرح اس کے رسم الخط کی بھی پوری حفاظت کی گئی ہے۔[۷]

میرا خیال ہے کہ ہر رسم الخط کا اپنا اندازِ تحریر ہوتا ہے، نسخ اور نستعلیق میں بھی یہی فرق سامنے آتا ہے، جب کہ کمپیوٹر کی تحریر کے اپنے مسائل ہیں۔ لفظ کی شکل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آتی ہو تو رسم الخط یا معمولی اندازِ تحریر کے فرق کو عقیدے کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔

پروفیسر غازی علم الدین اردو زبان، رسم الخط اور املا کو عقیدے کا مسئلہ تصور کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ:

"میرے نزدیک اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املا عقیدے کا مسئلہ ہے۔ برصغیر میں اردو کسی کی مادری زبان ہو نہ ہو، ہر مسلمان کی مذہبی و ثقافتی زبان ضرور ہے اور عربی و فارسی اسلامیانِ ہند کی واحد ترجمان ہے۔"[۸]

شمس الرحمان فاروقی اور دیگر علما کا پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب "لسانی مطالعے" جس میں انھوں نے اردو میں موجود عربی کے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کو عربی کے صحت تلفظ واملا کے مطابق بولنے، پڑھنے اور لکھنے پر زور دیا ہے، اور درج بالا نظریہ کہ اردو زبان، اس کا رسم الخط اور املا میرے لیے عقیدے کا مسئلہ ہے، پر محاکمہ فکر انگیز ہے۔ پروفیسر قاضی ظفر اقبال ان کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ اردو کے روزمرہ اور اردو کے رائج زبان سے آپ کی واقفیت کم ہے۔۔آپ کو عربی زبان سے بہت محبت ہے اور آپ اردو زبان کے بڑے ذخیرے کو معروب دیکھنا چاہتے ہیں۔[۹]

شمس الرحمان فاروقی ان کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ آپ زبان (اردو) کو ''معروب''ہی نہیں مشرف بہ اسلام بھی فرمانا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ رویہ ہرگز درست نہیں ہے، زبان پر مذہب کے اثرات ضرور ہوتے ہیں مگر کسی زبان کا فی نفسہ مذہب نہیں ہوتا۔ادب اور زبان کو مذہب کے معیار سے جانچیں گے تو بہت دور نہ چل سکیں گے او رآپ کو ادب اور زبان دونوں سے ہاتھ دھولینا پڑے گا۔آپ کہیں گے کہ میں ادب کی پروا نہیں کرتا، میرا سروکار مذہب سے ہے، بالکل ٹھیک ہے، لیکن اگر آپ زبان سے ہاتھ دھولیں گے تو مذہب کے بارے میں یا کسی اور چیز کے بارے میں کس طرح سوچیں گے، بولیں گے اور لکھیں گے؟[۱۰]

غازی علم الدین کی اس رائے تو اتفاق کیا جاسکتا ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان کی طرف الفاظ کے سفر سے بناوٹ میں تبدیلی اور معانی میں تنوع پیدا ہوتا ہے، یہی حال اردو میں مستعمل عربی کے ان الفاظ اور تراکیب کا ہے جو جزوی تبدیلی سے ایک سے زائد معانی دیتے ہیں ا ور بڑی خوبصورتی سے اردو کے دامن کو کشادہ کرتے ہیں۔ تاہم اروو میں موجود عربی کے الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کو عربی کے صحت تلفظ واملا کے طے شدہ اصولوں کے مطابق بولنے، پڑھنے اور لکھنے پر زور دینا۔"علمائے املا و قواعد کے نزدیک محلِ نظر ہے۔

اس لحاظ سے شمس الرحمان فاروقی کا ردِ عمل فطری تھا وہ لکھتے ہیں کہ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ عربی زبان کے الفاظ ہم اس طرح لکھیں اور بولیں جیسے کہ وہ عربی میں ہیں؟ متعدد الفاظ اردو میں اصل

معانی سے ہٹ کر نئے معنی میں بولے جاتے ہیں۔ بہت سے الفاظ ہم نے عربی کے قیاس پر بنالیے ہیں جو عربی میں نہیں ہیں۔فلک سے فلاکت ،مفلوک الحال ،نازک سے نزاکت ،گل بدن ،قمر چہرہ، مزاج دان،خوف ناک وغیرہ،بے شمار الفاظ ہیں ، ہم نے اردو یعنی دیسی الفاظ کو عربی لفظ سے بیاہ دیا ہے۔....ہر لفظ کو مطابقِ اصل لکھیں ،پڑھیں گے تو مصیبت آجائے گی،پھر کھیت کو کھشتیر سے بدلنا پڑھے گا۔....آپ زبان کے الفاظ کو اس کے اصل تلفظ کے ساتھ رائج کرنا چاہتے ہیں،زبان پر مقامی دھرتی ،مقامی موسموں ، مقامی مذاہب و عقائد اور مقامی کلچر کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کی وجہ سے زبان کے تلفظ ،املا، شکل و صورت ، حتیٰ کہ مفاہیم تک میں تبدیلیاں رونما ہوجاتی ہیں۔کچھ تبدیلیاں لوگوں کے لیے پسندیدہ ہوتی ہیں تو کچھ ناپسندیدہ ،مگر زندہ زبان کا یہ تنوع اور رنگارنگی ہی اس کی اصل خوب صورتی ہے۔اگر زمانے کی گردش سے ''ہیئت اولیٰ''ہیولیٰ ''اور''افراط و تفریط''،''افراتفری''میں تبدیل ہوجاتے ہیں تو میرے خیال میں یہ الفاظ کی نئی اور خوبصورت شکل ہے جسے خوش دلی کے ساتھ قبول کرلینا چاہیے ، ہیولیٰ کا املا ہیولا ، بالکل کا املا بلکل، زکوٰۃ کا املا زکات اور ربٰوا کا املا ربا بھی تسہیل کی جانب ایک قدم ہے ،مگر زبان دانوں کے لیے اسے قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل ہونے کے لیے صدیوں کا عمل درکار ہوتا ہے، بعض چیزیں وقت کے ساتھ قبول کرلی جاتی ہیں ور بعض آپ کے آپ مسترد ہوجاتی ہیں۔"[۱۲]

ڈاکٹر صابر لودھی بھی ملتے جلتے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ ہر لفظ کا اپنا کلچر ،اپنی تہذیب ہوتی ہے اور یہ کلچر کسی قوم کے مزاج اور تہذیب سے وجود میں آتا ہے۔لفظ ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو معنی،اعراب ،تذکیر و تانیث وغیرہ میں جزوی تبدیلی ضرور ہوتی ہے۔اردو کے معاملے میں اگر یہ ضد کی جائے کہ ہر لفظ کا تلفظ عربی،فارسی قواعد کے مطابق ہو تو مناسب نہیں،بہتر ہے کہ ملک کی قومی زبان عربی،فارسی کرلی جائے۔"[۱۳]

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ زبان کا مذہب نہیں ہوتا ،البتہ زبان کا سماج ہوتا ہے ،اور ہندوستانی سماج اردو کا سماج ہے۔ زبان کا مذہب نہیں ہوتا ،زبان جملوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور جملے لفظوں سے مل کر بنتے ہیں۔مذہب لفظوں کا نہیں ہوتا لیکن لفظ چونکہ مذہب ، اخلاق ، فلسفہ ، معاشرت ،سیاست وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں اس لیے لفظوں کے مذہبی یا طبقاتی ماخذ تلاش کیے جاسکتے ہیں۔"[۱۴]

اردو میں دخیل الفاظ کے حوالے سے علمائے املا و لسانیات میں عمومی اختلاف رہا ہے اور دونوں طرف سے دلائل سامنے آئے ہیں تاہم حدِ فاصل اتنا وسیع بھی نہیں جسے نہ پاٹا جاسکے۔ دخیل الفاظ کے املا

سے متعلق عقلی و منطقی مباحث زبان و ادب کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ اردو میں دخیل الفاظ کا معاملہ صرف عربی، فارسی کا نہیں بلکہ دیگر زبانوں کا بھی ہے، تاہم عربی چونکہ قرآن وحدیث کے تناظر میں مسلمانوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے اور تلاوت، ترجمہ و تفسیر کی صورت میں ان کی دلچسپی بھی اس زبان سے زیادہ ہے اس لیے عربی الفاظ کے تلفظ و املا کے معاملے میں حساسیت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہ ایک فطری امر ہے۔ اس لیے یہ سوال اٹھتا رہا ہے کہ دخیل الفاظ کو من و عن رائج کیا جائے یا اپنے نظامِ اصوات کے تابع کیا جائے اور جن الفاظ کا غلط املا رواج پا چکا ہے اسے متبادل قبول کیا جائے یا اس کو اصل اشکال کے ساتھ مروج کیا جائے۔[۱۵]

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے مطابق خان آرزو پہلے شخص ہیں جنھوں نے دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے متعلق یہ رائے دی کہ وہی صورت اختیار کی جائے جو اہلِ زبان میں رواج پذیر ہو چکی ہو، ایسے الفاظ کے لیے اصل زبان کی پیروی کی ضرورت نہیں۔[۱۶]

خان آرزو (۱۶۸۹ تا ۱۷۵۶ء) کی رائے:

اس معاملے (دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا) میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو اہل زبان (خواص و عوام دونوں) میں رواج پذیر ہوچکی ہو، ایسے لفظوں کے لیے اصلی زبان کی پیروی ضروری نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت سامنے رہنی چاہیے جو محض عوام ہی میں مروج نہ ہو بلکہ عام و خاص سب کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہے۔[۱۷]

انشاء اللہ خان انشا (۱۷۵۶ تا ۱۸۱۷ء) دریائے لطافت (۱۸۰۸ء) لکھتے ہیں:

"ہر لفظ جو اردو میں مشہور ہوگیا ہو، عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا یورپی، ازروئے اصل غلط ہو یا صحیح؛ وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر خلافِ اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اردو کے استعمال پر موقوف ہے کیونکہ جو کچھ خلافِ اردو ہے، غلط ہے۔"[۱۸]

تاہم مرزا ادیب لکھتے ہیں کہ انشا کا یہ نظریہ کہ اردو کا املا اس کا اپنا ہے، من مانی کاروائیوں کو جواز فراہم کرتا ہے، اس لیے جو لفظ اصل کے قریب ہو اس کے قریب رہنے ہی پر اصرار کیا جائے اور اس کا املا اصل کے مطابق ہونا چاہیے۔[۱۹]

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ جو لفظ پہلے سے رائج ہیں اور ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں ،خواہ کسی زبان کے بھی ہوں وہ اب ہمارے ہیں، غیر نہیں ،انھیں غیر سمجھ کر نکالنا سراسر حماقت ہے،جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنی زبان کے دوست نہیں، دشمن ہیں.....نئے لفظوں کے داخلے میں بھی زبان کی فطرت اور ذوق کو بڑا دخل ہے،اندھا دھند اور زبردستی لفظ داخل نہیں کیے جا سکتے،جو بندھ گیا سو موتی،جو کھپ گیا وہ ہمارا،اور جو نہیں کھپا سو غیروں کا۔[20]

شمس الرحمان فاروقی ، مولوی عبدالحق کی رائے نقل کرتے ہیں کہ بہت سے الفاظ کے بارے میں یہ فیصلہ ہی ناممکن ہے کہ وہ کس طرح رائج ہوئے ،مثلاً یہی دیکھیے کہ ہزاروں دیسی الفاظ میں ہمزہ کہاں سے آیا ؟ اور ہزاروں الفاظ میں عربی، فارسی آوازوں کے ساتھ وہ آوازیں کہاں سے داخل ہوئیں جو ان زبانوں میں ہیں ہی نہیں ؟لہٰذا ''شکل و صورت ''کا چکر چلانا بے معنی ہے۔[21]ان کا خیال ہے کہ زبان کو کسی کی مرضی کا پابند نہیں کر سکتے ،زبان رواج عام سے بنتی ہے اور رواج عام کے زیرِ اثر بدلتی ہے۔ کسی صاحب کو یہ اختیار نہیں کہ مروج زبان پر اپنی منطق یا اپنا فلسفہ جاری کرنا چاہے.....بہت سے علما کا خیال یہ ہے کہ ''اش اش کرنا'' اس لفظ کا ''عش عش ''غلط ہے کیونکہ یہ عربی نہیں ہے اور حرف عین ہندی میں نہیں ہے۔اور باتوں سے قطع نظر کہ ہماری گفتگو اردو زبان سے ہے ،اس میں ہندی کی سند لانا درست نہیں۔اردو کے حروفِ تہجی میں عین شروع سے شامل ہے،وہ چاہے جہاں سے بھی آیا ہو لیکن وہ ہے اردو کا حرف ،اور اردو کو اختیار ہے کہ وہ اسے استعمال کرتے ہوئے نئے لفظ بنائے کسی پرانے لفظ کا املا عین سے متعین کرے۔ عش عش کو عربی نہ ہونے کی بنا پر اش اش کی موافقت میں مسترد کرنا ، ناانصافی ہے.....علیٰ حدہ کو علیحدہ ،علاحدہ ، تشنیع کو طعن و تشنیع ،ناتا، کشتہ بنانا، طمانیت میں فرضی یا گھڑنا،اینگلو عربک کہنا، حالانکہ (انگریزی میں لکھتے ہوئے) عربی میں ''ع''نہیں۔صلوٰۃ کو صلوٰتیں بنا کر مقدس لفظ کو استعمال کیا،تو عش عش کو جگہ کیوں نہیں دی جا سکتی؟اگر استدلال یہ ہے کہ ہندی لفظ میں عربی حروف نہیں آ سکتے تو پھر مفلوک الحال اور ماتحت کو بھی ''ہ'' سے لکھا جائے کہ وہ بھی توآخر ہندی لفظ ہیں۔[22]

شمس الرحمان فاروقی کا خیال ہے کہ ہمارا معاملہ عربی یا ہندی سے نہیں بلکہ اردو سے ہے۔عربی میں کیا غلط ہے کیا صحیح ،ہمارے لیے بے معنی ہے۔اردو میں حرف عین استعمال ہوتا ہے،اب یہ محض اتفاق ہے کہ اردو کے جن لفظوں میں عین ہے وہ اکثر و بیشتر عربی سے آئے ہیں لیکن یہ بات خیال میں رکھیے کہ وہ لفظ کبھی عربی سے لیے گئے ہوں گے لیکن اب اردو کے لفظ ہیں ،بہت سے لفظوں کے معنی بدل گئے

ہیں، ان کے استعمال کرنے کے نحوی قاعدے عربی سے مختلف ہیں، اور تقریباً ہر لفظ بدل گیا ہے، لہٰذا یہ خیال غلط ہے جو حروف اصلاً عربی کے ہیں، ان سے کوئی اردو لفظ نہیں بن سکتا۔ آخر عربی کے حروف بھی تو عبرانی سے لیے گئے ہیں اور ان سے عربی لفظ بنائے گئے ہیں۔ یہ تو ہر زبان کا طریقہ ہے کہ غیر زبانوں سے لفظ یا حروف مستعار لیے جاتے ہیں اور پھر انھیں اپنا یا جاتا ہے۔[۲۳]

خلیق انجم لکھتے ہیں کہ دخیل الفاظ کے املا کے لیے اصل زبان میں ان الفاظ کے املا پر غور کرنے کے اصول کو تسلیم کیا جائے تو ہمیں فارسی کے علاوہ سنسکرت، عربی، انگریزی، پرتگالی، فرانسیسی، جرمنی وغیرہ سیکھنی پڑیں گی، کیونکہ ان تمام زبانوں کے الفاظ اردو میں شامل ہیں۔[۲۴]

طالب الہاشمی کا خیال ہے کہ غلط العام سے مراد وہ غلط تلفظ ہے جو عام اور خاص، جاہل اور عالم سب میں عام ہو جائے۔ نشتر مخفف ہے اور نِشتر ہونا چاہیے لیکن اہلِ زبان میں نشتر عام ہو چکا ہے۔۔۔۔ایک مشاعرے میں خواجہ آتش نے ایک شعر کہا:

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

کسی نے کہا یہ تو بیگَم ہے، آتش نے کہا جب ترکستان جائیں گے تو بیگَم کہیں گے یہاں تو بیگم ہے۔[۲۵]

لئیق، مرغن، شکریہ، خراج، مشکور، فوق البھڑک جیسے بہت سے الفاظ عربی کے انداز پر بن گئے ہیں اور عام طور پر مستعمل ہیں، اب اگر ایسے الفاظ کو غلط سمجھا جائے گا تو یہ اندازِ فکر اردو زبان کی خصوصیات کو زبانوں میں لفظ کے بگڑنے کے مسلمہ اصولوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوگا۔ متعدد الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا تلفظ اصل الفاظ کے اعراب سے مختلف ہو جاتا ہے مگر اردو میں ان کا چلن ہو گیا ہے اس لیے ان کا اس طرح بولنا یوں سمجھیے مباح ہے۔[۲۶]

پروفیسر آسی ضیائی لکھتے ہیں کہ ایک زبان جب تک مکمل نہیں ہوتی دوسری زبانوں کی محتاج اور پیرو ہوتی ہے۔ لیکن جب پوری طرح ادبی اور علمی زبان بن جاتی ہے تو اپنے الفاظ کے تلفظ، املا اور معنی کے اعتبار سے مکمل اور آزاد ہو جاتی ہے۔ اردو کے تلفظ میں جو بیرونی رجحانات ہیں انھیں نظر انداز کرکے اسی تلفظ کو مستند ماننا چاہیے جو اہلِ زبان کا ہے۔[۲۷]

ڈاکٹر اقتدار حسین کے مطابق ایک زبان میں لفظ یا کوئی دودسرا عنصر مستعار لے لیا جاتا ہے تو اس کے بعد اس لفظ میں زبان اپنے مزاج کے مطابق تبدیلیاں کر لیتی ہے جس کو ''تطبیق'' کہتے ہیں، مثلاً اردو

نے انگریزی سے لفظ ''ٹِن''لیا لیکن اس کو ''ٹین'' بنا لیا ،یعنی چھوٹے مصوتے کو لمبا مصوتہ بنا لیا گیا۔[۲۸]،پشتو زبان میں عربی لفظ (تفحّص) ''تپوس'' بن گیا ہے اور عام مستعمل ہے جو بولنے اور لکھنے کا حصہ بن چکا ہے۔[۲۹]

گوپی چند نارنگ کی نظر میں عربی کے جو الفاظ معرب ہو کر یا فارسی کے جو الفاظ مفرس ہو کر اردو میں داخل ہوئے ان کے املا میں اگر اصل کے مطابق بعد میں ترمیم نہیں ہوئی تو ان کی معرب یا مفرس صورتیں ہی قابلِ قبول ہوں گی۔فارسی یا عربی کی جدید تحقیقاتِ لغت اور ترمیماتِ املا سے اردو املا کی حد تک ہمیں کوئی غرض نہ ہو گی۔[۳۰]

حفیظ الرحمان واصف کا خیال تھا کہ جو دخیل الفاظ اردو نے اپنا لیے ہیں اور ان میں تصرف کیا ہے ،خواہ وہ لغت کے لحاظ سے غلط ہوں اگر فصحا و ادبا سے سندِ فضیلت حاصل کر چکے ہیں تو ان کو اصل کی طرف واپس لے جانا ممکن نہیں اور یہ کوشش کرنا ایک فعلِ عبث ہے۔[۳۱]،رشید حسن خان کی کتاب میں شامل سید سلیمان ندوی کے اقتباس (جس میں ان کی رائے کے مطابق مشکور کو متشکر یا شاکر بولنے والوں کی اصلاح شکریے کے ساتھ واپس کرنی چاہیے اور دخیل الفاظ کی جائے پیدائش نہیں دیکھی جاتی بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس زبان میں وہ شامل ہیں وہاں ان کا تلفظ کیسے ادا کیا جاتا ہے نیز عبدالماجد دریا بادی کی رائے کہ لفظ آپ کا اور اس کا املا ،اس کا تلفظ اور اس کی گریمر سب دوسروں کا'[۳۲]،پر اپنے تبصرے میں لکھتے ہیں کہ صحیح اور غلط کا امتیاز ان الفاظ میں بھی کرنا ہوگا جو خاص اردو کے ہیں یا سنسکرت اور برج بھاشا سے اردو میں آئے ہیں،اور یہاں بھی منہ دوسروں کا ہی دیکھنا ہوگا۔لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو گریمر کی اساس ہی عربی گریمر ہے (حفیظ الرحمان واصف کی یہ رائے درست نہیں،اور ان سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا) تذکیر وتانیث ،اعراب ،جمع،حالتِ ترکیبی ،املا ،تلفظ ،گریمر اور اصطلاحات وغیرہ عبدالماجد دریا بادی کہاں سے لائے؟ مذکورہ بالا اقتباسات سے فاضل مصنف نے یہ غلط نتیجہ نکالا کہ الفاظ کا جو بھی تلفظ عوام میں اور جہلا میں رائج ہے وہ قابلِ قبول ہے اور ہماری زبان کا گراں قدر سرمایہ ہے۔خواہ وہ کیسا ہی غلط ،بھونڈا اور مبتذل ہو،یعنی صحت و فصاحت کا کوئی معیار باقی نہ رہا۔سید سلیمان ندوی نے شاید اس وجہ سے خفگی کا اظہار کیا ہے کہ مولانا شبلی نے استعمال کیا ہے ،مگر وہ بھی انسان تھے ،سہو ہوگیا۔اور زبان کے باب میں مولانا آزاد پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔میں نے ان کو تقریر میں لفظ مستقبل بفتح'' با'' بولتے سنا ہے اور بار بار سنا ہے۔اسی طرح ان کی زبان سے ملزم بفتح''زا'' اور لفظ متوفی بالف مقصورہ بھی سنا ہے۔تعجب

ہے کہ انھوں نے لفظ مشکور کو کیوں جائز رکھا؟ مولانا موصوف نے اپنی ایک خاص زبان ایجاد کی ہے، فصحا کے نزدیک قابلِ استناد نہیں۔اگر لسانیات اور لغت میں منطق و فلسفہ کو مداخلت کا موقع دیا جائے تو سینکڑوں محاورے ترک کرنے پڑیں گے۔زبان کی ہر قسم تبدیلی کا نام ارتقا رکھ دینا، یہ فلسفیانہ نظریہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔[۳۳]

پنڈت دتاریہ کیفی نے بھی علامہ سلیمان ندوی کی تائید کی اور کہا کہ عادی اور مشکور مدتوں سے عادت گیرندہ اور احسان مند کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں اور متکلم اور سامع دونوں کا ذہن اس معنی کی طرف جاتا ہے تو قاموس اور صراح سے فتویٰ لے کر ان الفاظ کو اردو سے خارج کرنے میں کیا مصلحت ہے۔[۳۴]، پنڈت دتاریہ کیفی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے حفیظ الرحمان واصف لکھتے ہیں کہ جب کسی لفظ کا متبادل موجود ہو اور صحیح ہو تو حیرت ہے کہ اس غلط لفظ کو زبردستی کھینچ کر صحیح کی فہرست میں داخل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قاموس اور صراح سے فتوی لینے پر ہمیں اصرار نہیں، لیکن اگر فصاحت کا معیار صرف یہ ہے کہ سامع کا ذہن لفظ کے مدلول اور معنی تک پہنچ جائے تو کیا فتوی دیتے ہیں آپ اس وقت ؟جب تانگے والا پکارتا ہے ''آو ٹیسن کو'' جاہل عورتیں ڈاکٹر کو ڈانگدر کہتی ہیں، مرزا کے ہاں لمبر اور سکتر کے الفاظ ملتے ہیں، فصحا نے کیوں قبول نہ کیے؟ عوام کی روش کا ایسا رعب چھایا ہوا ہے کہ جہاں فصیح و غیر فصیح کا خیال آیا فوراً روانیِ کلام مجروح ہوئی، یعنی لفظ کی صحت و فصاحت کے مقابلے میں روانیِ کلام زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ تصرف، غیر فصیح، غلط العوام، غلط العام اور غلط کا فرق ملحوظ رکھنا ہوگا۔ادبا و شعرا اور ماہرینِ لسانیات کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ انڈسٹری (یعنی لغت سازی) بھی کارخانہ داروں اور صناعوں کے سپرد کرکے آپ کو اس دیس سے کوچ کرنا چاہیے۔آہ مظلوم اردو!..... جب کوئی لفظ بن جائے اور رواج پا جائے تو اسے قبول کرلینا چاہیے، قواعد کی خاطر ارتقائے زبان پر پابندیاں نہیں لگائی جاسکتیں۔الفاظ بنتے بھی ہیں، رائج بھی ہوتے ہیں اور متروک بھی ہوتے ہیں اور عرصے بعد غیر فصیح بھی ہوجاتے ہیں۔آوے ہے، جاوے ہے، کھبو، کسو، تمام متقدمین کے کلام میں اور فصیح تھے، اب متروک اور غیر فصیح۔استاد داغ کے زمانے کے بھی بہت سے الفاظ و محاورات بعض متروک ہو کر پھر زندہ اور فصیح ہوگئے ہیں جیسے ''رندھنا، کجلانا وغیرہ۔[۳۵]

دخیل الفاظ کے متعلق علامہ سلیمان ندوی کی رائے فکر انگیز ہے کہ ان فارسی الفاظ سے جنھیں ہم فارسی سمجھ کر استعمال کرتے ہیں، اہلِ ایران ان پر چوکتے ہیں اور ہماری ہنسی اڑاتے ہیں یعنی وہ الفاظ فارسی

کے نہیں رہے۔ ہم نے اردو میں ان کو دوسرے معنی دے دیے ہیں، اور اب وہ لفظ بالکل ہمارے ہو گئے ہیں۔ آپ ان کو اپنی زبان سے نکال دیجیے، آپ کے یہاں سے نکل کر وہ بالکل نکھٹرے ہو جائیں گے کیونکہ فارسی یا عربی ان معنوں میں انھیں قبول نہیں کریں گی۔[۳۶]

گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ اردو پر ہند آریائی، ایرانی اور سامی اثرات بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ زبان اور اس کے تمام ظواہر کسی فردِ واحد، ادارے یا انجمن کے حکم کے تابع نہیں، زبان ایک وسیع تر عمرانیاتی نظام کا حصہ ہے جو عوامی ضرورتوں اور رواج اور چلن سے وجود میں آتا ہے اور جسکی پشت پر صدیوں کے تاریخی و لسانیاتی ارتقا کا ہاتھ ہوتا ہے۔[۳۷]، دو قسم کے مکاتبِ فکر ہیں، ایک لسانیات والے اور دوسرے قدیم والے ہیں ۔ تیسرا مسلک بھی ہے جو عبارت ہے قدیم علمی روایت اور جدید لسانیات دونوں سے آگہی حاصل کرنے سے اور اس آگہی کی روشنی میں اردو کے مخصوص لسانی کردار اور ثقافتی مزاج کے پیشِ نظر املا کے مسائل کو حل کرنے سے۔ یہ شاخ (Sociao languistics) ہے، جو تاریخ، سماجی کردار اور ثقافتی مزاج سے مدد لیتی ہے۔ میرا مسلک ہے کہ صوتیات سے مدد لیتے ہوئے ثقافتی اثرات کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتے۔[۳۸]

جابر علی سید اور ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی اردو میں عربی، فارسی کلمات کے خلاقانہ تصرّف و تغیر کے جواز پر اصرار کرتے ہیں، جب کہ سیف اللہ خالد کے مطابق اس عہد کے علمائے لسانیات کے مقرر کردہ قواعد و ضوابط کو آسمانی صحیفے اور مقدس روایت کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان میں ترک و تبدیلی خارج از امکان نہیں۔ اردو کے تابع نظر دانش وروں نے عربی و فارسی الفاظ کو اپنی طرز اور ضرورت کے مطابق برتا اور بدلا، جس سے معنوی تنوع سامنے آیا۔[۳۹]

عبدالستار دلوی کے مطابق عربی نے اردو زبان و ادب پر مثبت اثرات مرتب کیے ہیں اور ان سے انکار ممکن نہیں۔ عربی فارسی خصوصیات کی وجہ سے اردو میں اظہاریت کی قوت بڑھ گئی ہے ،اس لیے اردو کا صوتی نظام دیگر ہندوستانی زبانوں کے صوتی نظام کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ دخیل الفاظ جب زبان میں شامل ہو جائیں تو وہ پرائے نہیں رہتے، اپنے بن جاتے ہیں۔ فلسفۂ زبان کا یہ بنیادی اصول ہے، اردو نے ہندی کے مقابلے میں ہمیشہ اس اصول کی پابندی کی ہے۔[۴۰]

شمس الرحمان فاروقی کے مطابق دخیل الفاظ کو غیر ضروری اہمیت و تقدس عطا کرنا ایک طرح کی اشرافیت (elitism) کہا جاسکتا ہے اور ممکن ہے اسے اشرافیت ہی خیال کرکے اختیار کیا گیا ہو ، لیکن

ظاہر ہے کہ ''اشرافیت'' زبان کے فطری ارتقا کے خلاف تھی اور اس کے نتیجے اچھے نہیں نکلے۔ایک تو یہ کہ ہماری زبان غیر ضروری اور مصنوعی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہو گئی، دوسری بات یہ کہ ان پابندیوں نے ایک مصنوعی زبان کو فروغ دیا، جو اصل بول چال سے مختلف تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان قیود کے باعث زبان میں وسعت کے امکانات تنگ ہو گئے۔نہ صرف یہ کہ امکانات تنگ کر دیے گئے بلکہ وہ ہزاروں استعمالات اور روزمرے جو زبان میں داخل ہوئے تھے ،انھیں بھی متروک قرار دے کر ''معیاری'' زبان سے نکال دیا گیا۔[۴۱]

ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں جب کوئی لفظ زبان میں داخل ہوتا ہے تو ان تبدیلیوں کے پیچھے ایک طویل زمانی تسلسل (Time Continuation) اور زمانی علائق (Spatial relation) کے ساتھ ساتھ عصری ادراک ،استدلالیت اور تراش خراش کی فطری جبلت یکساں دخیل ہوتے ہیں۔ جیسے اصل اشکال میں تبدیلی کا غیر فطری ،الحاقی محاکمہ ،نارسیدگی یا جبری، شعوری کوششیں یا تجربہ؛ لفظ کی عامۃ الناس میں قبولیت کی ضمانت نہیں بن سکتا۔اسی طرح عصری دانش کی مشارکت کے بغیر زمانی و مکانی تسلسل بھی لفظ کے قبولِ عام کا ضامن نہیں ہو سکتا۔انسانی تاریخ پر نظر ڈالنے سے بھی جو لسانی ارتقا دکھائی دیتا ہے۔ وہ کسی غیر منظّم ارتجال کا نتیجہ نہیں، بلکہ انسانی ارتقا سے ارتباط کا فطری ترتیب میں منظّم استدلال ہے۔[۴۲]

اردو ایک الگ زبان ہے اور اس کو عربی یا کسی بھی زبان کے زیرِ اثر یا تسلط دیکھنا یا ثابت کرنا درست نہ ہوگا۔اکثر علمائے لسانیات کی یہ رائے منطقی بنیادوں پر استوار نظر آتی ہے۔دخیل الفاظ کے مباحث میں اردو کی خود مختار حیثیت کا سوال بھی اٹھتا ہے ۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا خیال ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو نے سنسکرت ، عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی سب سے اس نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا لیکن حاکمیت اپنی رکھی۔ان کا خیال ہے کہ زبانیں بدلتی ہیں، تغیر اس کی فطرت کا حصہ ہے، تاہم اردو ایک الگ زبان ہے اور یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے۔اردو نے اپنی لغت ،اپنا اسلوب، صرفی و نحوی قاعدہ اور جمع ،تذکیر و تانیث کے الگ اصول بنا کر فصاحت و بلاغت اور حسن و اثر کا معیار متعین کیا۔ جو الفاظ اردو نے دوسری زبانوں سے لیے ہیں ان کے سامنے سر نہیں جھکایا بلکہ پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ دیکھا، بھالا، جانچا اور پرکھا ہے۔جو اس کے مزاج کے موافق تھے انھیں جیسے تھے ویسے ہی رہنے دیا اور جو مزاج کے خلاف تھے انھیں بے دھڑک کاٹا ،پیٹا، چھانا، گھس گھسایا اور چھیل کر اپنی پسند کا بنا لیا۔کانٹ چھانٹ اور تبدیلی و تصرف کا یہ عمل جیسے اردو یا مؤرد کہنا چاہیے ،حروفِ تہجی کی آوازوں ،الفاظ کے تلفظ ،ان کے معنی

اور املاہر شعبے میں ہوا ہے۔اردو کسی زبان کے بطن یا کسی خاص مذہب و قوم کے جبر و اثر سے وجود میں نہیں آئی، بلکہ معاشرتی ضرورتوں نے اسے جنم دیا۔[۴۳]

شان الحق حقی بھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری سے متفق نظر آتے ہیں کہ اردو اپنے لب ولہجہ ،رکھ رکھاؤ،روزمرہ و محاورہ ،انداز بیاں، موضوع و مواداور مختلف الفاظ کے استعمال و ایجاد کے لحاظ سے ایک علیحدہ زبان ہے اور مخلوط و مشترک زبان ہونے کے باوجود کسی زبان کی مقلداور تابع نہیں،اردو میں عربی، فارسی، سنسکرت کے سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو اپنے اصل تلفظ کے بر عکس ہیں۔[۴۴]

عبدالستار دلوی کی بھی یہی رائے تھی کہ ہماری یہ کوشش کہ ہم اردو، عربی و فارسی صوتیات ہی کے مطابق بولیں ،لسانی اعتبار سے صحیح نہیں ، وہ لوگ جو اردو کے طرز میں بولتے ہیں وہ کسی طرح لائقِ مذاق نہ بننے چاہئیں۔[۴۵]

رشید حسن خاں کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ بس اسی طرح صحیح جس طرح ان زبانوں کے لغات میں محفوظ ہے تو یہ سمجھا جائے گا یا سمجھنا چاہیے کہ یہ شخص اردو کو کوئی مستقل زبان نہیں سمجھتا،اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے تلفظ کے وہ سارے تغیرات لازماً قابلِ قبول ہیں جو کسی بھی شخص کی گفتگو میں نمایاں ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو زبان کے اعتبار اور لغت کے استناد کے مسائل سے دلچسپی نہیں ہے۔[۴۶]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے خیال میں اردو نے عربی و فارسی میں پہلے ہی سے تغیر و تصرف جاری رکھا ہوا، جیسے ''زات اور زرا''. بعض علما کا خیال ہے کہ یہ ان معنوں میں بالکل عربی کے نہیں،اس لیے ز سے لکھے جائیں۔ کیا املا کے تعین میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا املا کیا ہے؟اس طرح دخیل الفاظ کے تصرف اور تارید کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ کچھمن کو لکشنڑ اور ماچس کو میچ باکس لکھنا ہوگا۔ غیر زبان کا کوئی لفظ اردو میں جس طرح مستعمل و مقبول ہوگیا وہی اردو ہے،سیاسی اور لسانی ضرورتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔[۴۷]،ان کا خیال ہے کہ اردو میں دخیل الفاظ کی جو املائی شکلیں رائج ہو چکی ہیں ،انھیں اسی طور پر قبول کیا جائے اور ان کی اصل سے قربت پر اصرار نہ کیا جائے، تمیز، تمیّز تھا اور جَد و جہد کو جِد وجُہد نہ لکھا جائے۔ تاہم ڈاکٹر شیر محمد زمان کا خیال تھا کہ اصل لفظ جِد وجُہد ہے،اور اس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[۴۸]

اس سلسلے میں غازی علم الدین کی اس رائے سے تو اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہوتے وقت اپنے اصل معانی و مفاہیم بدل لیتے ہیں۔اس کا سبب لسانی انجذاب، قوموں کا اختلاط ،طرزِ معاشرت، ثقافتوں اور موسموں کا اختلاف ہو سکتا ہے۔یہی صورتِ حال بہت سے عربی الفاظ کی ہے جو اردو میں استعمال ہوتے وقت اپنے بنیادی معانی بدل لیتے ہیں۔اردو نے اپنے دامن کی وسعت اور کشادگی کا ثبوت دیتے ہوئے علمی، ادبی، معاشرتی، ثقافتی، اصطلاحی اور فنی موضوعات پر عربی کے خوبصورت الفاظ و تراکیب کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔جزوی تبدیلیوں کے ساتھ مزید الفاظ و تراکیب کی آمد کا ہمیشہ امکان رہے گا۔ خصوصی حالات میں یہ عمل اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔تاہم یہ بات کہ ”البتہ احتیاط، پاس اور لحاظ ملحوظ رکھنا ہو گا کیونکہ اس جزوی تبدیلی سے تشکیل پانے والا لفظ مادے (Root) کے اعتبار سے اصل عربی لفظ سے متصادم و مخالف نہ ہو۔“[۴۹] کلی طور قبول نہیں کی جا سکتی۔

اردو املا کا ایک اہم ”مسئلہ ہائے مختفی“ اور ”الف مقصورہ“ کے استعمال کا بھی ہے۔رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ''اردو املا''[۵۰] میں ہائے مختفی اور الف مقصورہ کے متعلق جو مباحث رکھے ہیں، اہم علمائے املا جیسے حفیظ الرحمان واصف،[۵۱] گوپی چند نارنگ،[۵۲] ابو محمد سحر[۵۳] و دیگر نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ الف اور ہائے مختفی کے حوالے سے اختلاف کا پہلو بہر حال موجود ہے، اگرچہ اس حوالے سے جزوی اشتراکات و اتفاقات بھی ملتے ہیں تاہم اکثر کی رائے یہ ہے کہ عربی، فارسی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی اور دیگر زبانوں کے الفاظ میں الف لکھا جائے جیسے: اڈا، تانگا، روپیا، باجا، وغیرہ۔ مقتدرہ قومی زبان[۵۴]، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ چلن، روایت اور استعمال کے حق میں ہیں۔ فضائل خان کی تجویز اور جہانگیر کے حکم،[۵۵] سے لے کر دیبی پرشاد،[۵۶] احسن مارہروی،[۵۷] عبدالستار صدیقی،[۵۸] رشید حسن خاں، گوپی چند نارنگ اور ادب و لسانیات کی تحقیق و ترقی سے وابستہ اداروں تک؛ عمومی خیال یہی ہے کہ ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں ''ا'' آئے گا نہ کہ ہائے مختفی۔اس سلسلے میں رشید حسن خاں کا استدلال ہے کہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ بھی ''الف'' کے ساتھ لکھے جائیں جو اب ان زبانوں میں اس طرح نہیں لکھے جاتے، علاوہ ازیں اردو عربی اور اردو فارسی مرکب الفاظ بھی الف سے لکھے جائیں۔ شہروں کے ناموں کے حوالے سے عمومی اتفاق یہی ہے کہ وہ ہائے مختفی کے ساتھ لکھے جائیں، البتہ بعض علما کا خیال ہے کہ وہ بھی ''ا'' کے ساتھ ہی لکھے جائیں۔ رشید حسن خاں غیر معروف شہروں کے ناموں کو ''ا'' کے ساتھ لکھنے کی سفارش بھی کرتے

ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری،[۵۹] التباس سے بچنے کے لیے ہندی الاصل الفاظ کو ''ا'' سے لکھنے کے حق میں ہیں، جبکہ تصرف شدہ الفاظ کو دونوں طرح لکھنے کی سفارش کرتے ہیں۔

حفیظ الرحمان واصف اور گوپی چند نارنگ ہائے مختفی کے استعمال کے حق میں ہیں، جب کہ حفیظ الرحمان واصف اور شمس الرحمان فاروقی دونوں اردو میں ''ہ'' ہائے مختفی کے وجود کے بھی قائل ہیں اور اس کی پر زور دلالت کرتے ہیں۔ الف ممدودہ کے حوالے سے عمومی اتفاق کا پہلو سامنے آتا ہے۔ علمائے املا اور ادب و لسانیات کی تحقیق و ترقی سے وابستہ ادارے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ جن الفاظ میں ''آ'' کا استعمال ہوتا تھا مگر مرورِ زمانہ یا تغیرات کی وجہ سے اب ان میں ''آ'' نہیں رہا ان کو اس کے بغیر لکھا جائے، جیسے خوشامد، برفاب، جب کہ جن میں ''آ'' موجود ہے، ان میں ''آ'' ضرور لکھا جائے، جیسے جہاں آرا، دلآرام، دوآبہ وغیرہ۔

الف مقصورہ کے استعمال اور عدم استعمال کے حوالے سے کافی اختلاف موجود ہے۔ عبدالستار صدیقی[۶۰]، عربی مہینوں اور بعض الفاظ میں اس کے استعمال کی حمایت کرتے ہیں تاہم وہ الف مقصورہ کے حق میں نہیں۔ ان کی بھرپور تائید رشید حسن خاں نے کی ہے، وہ صرف عربی آیت یا حدیث کے حوالوں کی صورت میں الف مقصورہ کے قائل ہیں علاوہ ازیں وہ الف مقصورہ کو مکمل طور الف میں تبدیل کرنے کے حق میں ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور دیگر اہم علما چلن اور روایت کے حق میں بھی ہیں لیکن ان میں بھی جزوی اختلاف کا عنصر موجود ہے۔

حفیظ الرحمان واصف، رشید حسن خاں کی اس منطق (عربی، فارسی تراکیب کی تقسیم بندی اور الگ الگ معیاراتِ املا) پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ وہ عربی ترکیب ہے اور یہ فارسی، اگر پہلے کا مروجہ املا آپ کے نزدیک دماغی پراگندگی کا سبب تھا تو یہ انقلاب پہلے سے زیادہ پراگندگی کا موجب ہوگا اور بہت سی خرابیوں کا سبب بنے گا؛ مثلاً ایک ادارے کا تاریخی نام ''دارلہدیٰ الوعظ'' ہے اس کے اعداد، ۱۲۶۸، ہیں، یہ اس کا سالِ تعمیر ہے، مؤرخ کا قلم جو اس نئے انقلاب کا خوگر ہو جائے گا اپنی تحریر میں اعلا، ادنا، مصطفا وغیرہ لکھے گا ''دارلہدا'' لکھ دے گا اور مادۂ تاریخ غلط ہو جائے گا۔، مسجدِ اقصیٰ، من و سلویٰ، دمِ عیسیٰ، عصائے موسیٰ، علی مرتضیٰ وغیرہ ان الفاظ کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں، ان کو ادب و تاریخ کے صفحات سے محو نہیں کیا جاسکتا اور بغیر ان روایات کے معانی و مواقعِ استعمال ہی سمجھ میں نہیں آ سکتے، ان مٹ روایات میں سے ان کا یہ املا بھی ہے کہ آخر میں الف

بشکلِ (یٰ) لکھا جاتا ہے۔ متقدمین نے اشتباہ اور التباس سے بچنے کے لیے بعض الفاظ میں استثنا دیا تھا، یعنی الف مقصورہ کو سیدھے الف سے لکھنا پسند کیا، مدعٰی، مجلیٰ، منتہیٰ، منادیٰ وغیرہ۔

مصلیٰ (اسمِ ظرف) مصلی اسمِ فاعل امتیاز کے لیے اسمِ مفعول کو الف سے لکھا۔

مدعیٰ ادعا کا اسم مفعول اسمِ فاعل ہے مدعی نیز مقتدیٰ، مقتضیٰ، مولیٰ، مجلّی وغیرہ،[۶۱]

تقاضا، تماشا، تمنا، تبرا، تولا، تجلا؛ ان میں تو الفِ مقصورہ نہیں تھا، تلافی اور تسلی کے وزن پر تھے ،ایرانیوں نے ''ی'' کو الف سے بدل دیا۔ اردو میں کثیر الاستعمال ہیں اور الف سے ٹھیک ہیں۔ مندرجہ بالا الف کا استثنا معقول وجوہ کی بنا پر تھا، من کل الوجوہ ایرانی کاروائیوں کی پیروی ہم پر فرض نہیں۔ تقویٰ، عیسیٰ، موسیٰ، دعویٰ اردو میں بہ یائے معروف نہیں بولے جاتے، ان کا تسلی و تشفی کے ساتھ قافیہ باندھنا محض ادبِ فارسی کی تقلید ہے، فصحائے اردو کا ذوق اس کو قبول نہیں کرتا۔ لفظ متوفی کو سیدھے الف سے لکھنا چاہیے، یہ تبدیلی پسند آئی، اولیٰ کو اگر الف سے اولا لکھا جائے تو اس میں اور اولا بمعنی ژالہ میں اور اسی طرح ماویٰ کو اگر الف سے لکھا جا سکتا ہے تو اس میں اور ماویٰ بمعنی کھویا میں مابہ الامتیاز کیا ہوگا؟[۶۲]

اضافت کی صورت میں چونکہ ایک (یے) کا اضافہ ہو جاتا ہے اس لیے (یٰ) کو الف کی شکل دی جاتی ہے تاکہ دو (ے) کا اجتماع نہ ہو، دعوائے وفا، لیلائے شب۔ یہ ایک ضرورت تھی اس کو دلیل بنا کر اصل وضع و ہیئت تبدیل نہیں کی جائے گی۔ فاضل مصنف نے بعض ایسے الفاظ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو عربی ترکیب میں استعمال ہوتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ ایسے الفاظ سے اجتناب کیا جائے، مثلاً علی الحساب، علی الصباح، علی الترتیب، علی الاعلان، حتی الامکان، حتی المقدور وغیرہ۔ شاید یہ ذہن میں نہیں رہا کہ علی الحساب کا لفظ تو ان پڑھ عوام اور بنیے بھی بولتے ہیں، اس کو قاعدے سے مستثنیٰ کیوں کیا گیا؟ ایسے ہی بقیہ الفاظ بھی رائج ہیں، ان الفاظ میں (یٰ) لکھنے کی اجازت دی گئی ہے، لیکن تعالیٰ، مصطفیٰ وغیرہ کو مسخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔[۶۳]

''املا نامہ'' کے پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال تھا کہ عربی کا الف مقصورہ اردو میں نہ کھپ سکا اس لیے اکثر استعمال ہونے والے الفاظ اردو کے قاعدے سے لکھے جائیں، مثلاً علٰحیدہ، علاحدہ، زکوٰۃ، زکات وغیرہ۔ البتہ عربی، فارسی مثال یا ترکیب یا مصرع جس کی مثال اقتباس یا مقولے کی ہو

اسی طرح رہنے دیا جائے۔ تاہم دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے زکوٰۃ، مشکوٰۃ وغیرہ کو برقرار رکھنے کی سفارش کی۔ ہم جسے اصلاح کہتے ہیں وہ کبھی کبھی تخریب بن جاتی ہے، جیسے صلوٰۃ کو صلات لکھنا۔[۶۴]

شمس الرحمان فاروقی کے خیال میں عربی کے الف مقصورہ کو سیدھے الف میں بدل لینے کا رجحان اردو، فارسی میں ایک عرصے تک رہا، اب بہت کم ہوگیا ہے کہ اردو میں اب رجحان اس کے خلاف ہے۔ دعوا (دعویٰ) اعلا (اعلیٰ) استعفا (استعفیٰ) وغیرہ مقبول نہیں ہوئے۔ مطبعِ مجتبائی اور مطبعِ مصطفائی ان مطبعوں کے مالکان نے آپ ﷺ کی ذات سے التباس زائل کرنے کے لیے ایسا لکھا ہے۔ جو رائج ہوا وہ انسب ہے، رجحان، زکات، صلات وغیرہ درست بتایا جاتا ہے۔[۶۵]

ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں کہ وہ (رشید حسن خاں) عیسیٰ، موسیٰ کو الف مقصورہ سے لکھنے کی بات کرتے ہیں، ان کے ہاں اس کی دلیل یہ ہے کہ جیسے بولو ویسے لکھو، اگر اس دلیل کو مان لیا جائے تو اردو املا ایک زبردست بحران میں مبتلا ہو جائے گا کیونکہ ہم عربی کے بہت سارے الفاظ ایک ہی طرح بولتے ہیں جیسے ''ز، ذ، ض اور ظ'': ان سب کا تلفظ ایک ہی طرح کیا جاتا ہے اگر جیسا بولو ویسے لکھو کے تحت تمام املا کا کام ''ز'' سے لیا جائے، جن میں ''ص، ز اور ذ'' ہیں تو اردو کا کیا حشر ہوگا؟ موسیٰ، عیسیٰ لکھنے کے لیے انھوں نے کوئی عقلی دلیل دی ہے نہ اصول اور استثنا کا سبب۔ اردو میں عربی کے مروج کئی الفاظ و تراکیب کا املا اگر الف مقصورہ کے بغیر کیا جائے تو کیا حشر ہوگا جیسے عظمیٰ، کبریٰ، وسطیٰ حتیٰ، قیامتِ صغریٰ، عید الاضحیٰ، خیر الوریٰ، مسجدِ اقصیٰ، شمس الہدیٰ، کشف الدجیٰ، نور علیٰ نور وغیرہ، دراصل ہم بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں اور کسی لفظ کو کسی خاص انداز میں لکھ کر سمجھتے ہیں کہ دانش وری کا حق ادا ہوگیا، کیونکہ ''ہم تو ہیں ہی درست'' باقی لوگوں کو چاہیے کہ اپنا املا اور دماغ دونوں درست کرلیں۔ گو اس قسم کا تکبر علمیت کی ضد ہے، رہے قاری اور رہی بے چاری اردو تو ہمیں ان سے کیا، ہمیں تو اپنی دھاک بٹھانی ہے اور دھاک اصول اور دلیل سے نہیں بیٹھتی، نرالے سے بیٹھتی ہے۔[۶۶]

رفیع الدین ہاشمی بھی اعلی کو اعلا لکھتے ہیں۔[۶۷]

اردو میں الف مقصورہ کے استعمال کے حوالے سے غازی علم الدین کی گزارشات فکر انگیز ہیں، یائے معروف (ی) پر الف مقصورہ کے نہ پڑھنے سے تبدیلِ معانی کے ضمن میں علمی دلائل دیتے ہیں۔ اردو میں مستعمل عربی کے ایسے اسماء (فاعل) بھی ہیں، جن کے آخر میں یائے معروف (ی) پر اگر الف مقصورہ یعنی کھڑی زبر ڈال دی جائے تو وہ فاعل سے مفعول بن جاتے ہیں، اردو بولنے والے اکثر

لوگ اس مفعول کے الف مقصورہ کا خیال نہیں کرتے، جس سے مفعول کی بجائے فاعل کے معنی بن جاتے ہیں۔

(تذکیر) مغوی: اغوا کرنے والا، مغویٰ: جسے اغوا کیا گیا، متوفی: وفات دینے والا، متوفیٰ: جو فوت ہوا مسمّیٰ: نام رکھنے والا، مسمّیٰ: جس کا نام رکھا گیا (تانیث) مغویہ: اغوا کرنے والی، مغوات: جسے اغوا کیا گیا، متوفیہ: وفات دینے والی، متوفات: وفات شدہ مسمیہ: نام رکھنے والی، مسمات: جس کو نام دیا گیا،[۶۸]

ڈاکٹر ایس ایم زمان کا خیال تھا کہ لسانی تاریخی ارتقا کے حوالے سے اور مذہبی نقطۂ نظر سے املا اور رموزِ اوقاف کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عیسیٰ، موسیٰ، اعلیٰ، ادنیٰ جیسے الفاظ کی مروج اشکال ہی برقرار رکھی جائیں، اس لیے کہ اگر آج ہم نے اعلیٰ کو الف مقصورہ کی بجائے الف سے لکھنے کا فیصلہ کر لیا، تو ہمارے بچے قرآن پڑھتے ہوئے ان الفاظ کی املائی اشکال سے آشنائی حاصل کر لیتے ہیں اور یہ شکلیں ان کے ذہنوں میں راسخ ہو چکی ہیں اور جب ان ہی الفاظ کو مختلف روپ میں دیکھیں گے، تو نہ صرف ان کے لیے یہ الفاظ اجنبی ہوں گے، بلکہ ان کے تہذیبی، ادبی اور مذہبی پس منظر سے کاٹ دے گا۔[۶۹]

درج بالا مباحث؛ حفاظت قرآن کے تناظر میں، اردو میں عربی الفاظ کے تلفظ و املا پر عربی اصول و قواعد کا اطلاق، اردو کا مطالعہ مذہب کے تناظر میں کرنا، اردو زبان، رسم الخط اور املا کو عقیدے کا مسئلہ بنانا وغیرہ۔ یہ جہاں عقیدت و احترام کا پہلو رکھتے ہیں وہی لسانیات کی رو سے محل نظر بھی ہیں۔ جس طرح معانی اہمیت رکھتے ہیں، ویسے ہی الفاظ کا تلفظ و املا بھی اہم ہوتے ہیں، تاہم جزوی حقیقت ہے نہ کہ کلی اور یہ ہم سے لچکدار رویے کا تقاضا کرتے ہیں۔ علمائے لسانیات کی یہ رائے درست ہے کہ اردو کا اپنا روزمرہ محاورہ ہے۔ اردو الفاظ کو زبردستی معرّب کرنا بھی درست نہیں۔ زبان کو مذہب کی نظر سے دیکھنے کے بجائے سماج کی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر زبان اور ہر لفظ کے کلچر اور تہذیب کی حقیقت کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اردو ایک خود مختار زبان ہے اور اس کو الفاظ میں تصرف اور اپنے سانچے میں ڈھالنے کا بھرپور حق حاصل ہے۔ عربی اور اردو ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں، ان دونوں میں احترامِ تلفظ و املا کے ساتھ ساتھ تصرف و تبدل کا رشتہ بھی موجود ہے اور اس کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے۔ تصرف کو قبول کرنا ہوگا، جس طرح ہم معرب کے قائل ہو چکے ہیں اسی طرح مفرس اور مؤرَد کو بھی کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے۔ اگر لفظوں اور زبانوں کا تغیر و تصرف فطری عمل کا

حصہ ہے تو اردو کو املائی لحاظ سے دیگر زبانوں کا محکوم یا پابند بنانا جائز ہوگا؟اس سوال کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کیا عربی زبان یا عرب ممالک کا موجودہ چلن قرآنی عربی ہی ہے؟کیا وہاں لہجوں اور لفظوں کا تغیر نہیں ؟ مسئلہ تبدیلی سے کہیں زیادہ زبان کے مزاج اور چلن کا ہے۔اسی طرح الف مقصورہ کا جو چلن اور استعمال اس وقت اردو املا میں موجود ہے،وہی رہنے دیا جائے۔زبان کو رواج اور چلن کی کسوٹی پر پرکھنے والے زیادہ درست نظر آتے ہیں۔ ذاتی نوعیت کی اصلاح پسندی یا منطق یہاں زیادہ ساتھ نہیں دے پاتی ،بلکہ انتشار اور افراتفری کا باعث ہوتی ہے۔۲۷، تاہم درست اور غلط کا امتیاز ملحوظ رکھنا بھی بہر حال ضروری ہے۔غلط کو ماننا اور رواج دینا بھی زبان کی خدمت نہیں اور لسانی اصولوں کے خلاف ہے۔اس کے لیے انشا اور دوسرے ماہرینِ لسانیات کے دلائل کی آڑ یا سہارا لینا بھی درست طرزِ عمل نہیں ہوگا۔

تلفظ و املا کے مباحث کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض اوقات عربی طرز املا کے حوالے سے، عجیب سا رویہ سامنے آتا ہے۔ متبادل تلفظ و املا نہیں تو عربی طرز کو اختیار کرتے ہیں اور جہاں متبادل نکل سکتا ہے تو فوراً مقامی و دخیل کی بحث،ایں چہ معنی دارد؟اگر مروجہ املا میں بعض ہندوستانی، غیر عربی، فارسی الفاظ ایسے ہیں جن کو عربی قاعدے کی سان پر چڑھا کر اسی انداز سے لکھا جاتا ہے تو کیوں نہ ان کو یوں ہی برقرار رکھا جائے؟ یہاں تصرف کو تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا یا تسلیم نہ کرنے میں کیا قباحت ہے؟عربی زبان سے متعصبانہ رویہ یا لسانیات کا تقاضا؟اگر ہندی الاصل الفاظ کے لیے ''الف '' سے لکھنے پر زور دیا جاتا ہے تو عربی الاصل الفاظ کے لیے اشتقاق اور تلفظ ملحوظ رکھنے کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے؟یہ دونوں نظریات لسانی لحاظ سے درست قرار نہیں دیے جاسکتے۔اس لیے لامحالہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر ہم نے املا کے معاملے میں اتنی پابندیاں کیوں لگائی ہیں ؟ہر ضروری لفظ کو خوش آمدید ،زبان کی تارید و تہنید پر راضی برضا مگر املا کے معاملے میں دخیل الفاظ کی طرف رجوع اور اس میں بھی عربی سے اغماض اور فارسی کے معاملے میں رجوع ''ایں چہ معنی دارد؟صوتیات اور املا ہم سے توازن کا تقاضا کرتے ہیں۔دونوں طرف کی انتہاپسندی زبان اور لسانیات کے حق میں ہے نہ ان کا مقصود۔دونوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔قدیم وجدید تصورات کا نقطۂ اتصال تلاش کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس کے لیے علمائے املا اور زبان وادب سے وابستہ اداروں کو سنجیدگی سے آگے بڑھنا ہوگا تاکہ ان مسائل کا قابلِ قبول حل تلاش کیا جاسکے جو کہ ہرگز ناممکن نہیں۔ڈاکٹر ایس ایم زمان اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تجاویز درست ہیں کہ اردو املا کے مسائل ،اردو کے تہذیبی، ثقافتی، لسانی ارتقا، چلن اور صوتیات کے تقاضے

مد نظر رکھ کر حل کیے جائیں۔ تضادات اور عدم مطابقت(inconsistence) کو رد کردیا جائے۔اصولوں کوواضح کیاجائے اور چلن کی معیار بندی کی جائے۔جو چلن میں ہیں یا بزرگوں کی روایت سے ہم تک پہنچی ہیں، صوتیاتی اور ثقافتی دونوں تقاضوں کوسامنے رکھ کر ان کے تضادات کو دور کرکے ان کوسادہ اور سہل بنایا جائے اور ایک آسان نظام کے تحت قاعدہ بند(Systematic) کیا جائے۔سفارش میں چلن، صوتی ضرورت کی سائنسی وضاحت ضروری ہے، صرف حکم لگادینے سے کام نہیں چلے گا۔[۱] "معیار بندی کے لیے ترجیحات اور اصول طے کرنا اگرچہ ضروری ہے،اس کے باوجود چلن میں بعض دوسری شکلیں بھی رہیں گی۔ان پر چیں بہ جبیں ہونے کی ضرورت نہیں،زبان میں تبدیلی حکم لگانے سے نہیں ہوتی، ہمارا کام اصولوں کو واضح کردینا ہے جیسے جیسے ان کا عرفان ہوتا جائے گا، یہ چلن میں آتے جائیں گے۔"[۲]

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International Licence.

حوالہ جات

۱۔ قرآن: الحجر: ۹

۲۔ غازی علم الدین، پروفیسر، لسانی مطالعے، ص ۱۳۹، ط دہلی،، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵

۳۔ غلام ربانی مجال، خواجہ ،آسان قاعدہ، ص ۴۹، ۵۵۳، مشمولہ اخبارِ اردو،ط اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد ۲۰، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۰۴ء

۴۔ شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو لسانیات، ص ۲۳۵،ط کراچی،، مکتبۂ تخلیقِ ادب، ۱۹۶۶ء

۵۔ اعجاز راہی، مرتب، رودادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص ۱۳۳، ۱۲۳، ط اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۶۔ رشید حسن خاں، اردو املا، ص ۶۴،ط دہلی، نیشنل اکادمی، ۱۹۷۴ء

۷۔ حفیظ الرحمان واصف، ادبی بھول بھلیاں، ص ۱۷،ط دہلی، کلر پرنٹنگ پریس، بازار چتلی قبر، ۱۹۷۹ء

۸۔ لسانی مطالعے، ص ۲۴۶

۹۔ ظفر اقبال، قاضی، خط بنام پروفیسر غازی علم الدین، مشمولہ اردو: معیار اور استعمال، مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ص، ۲۴۳، ۲۴۴،ط دہلی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۴ء

۱۰۔ شمس الرحمان فاروقی، خط بنام پروفیسر غازی علم الدین، مشمولہ اردو: معیار اور استعمال، مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ص۲۳۰

۱۱۔ لسانی مطالعے، ص۱۳۹

۱۲۔ شمس الرحمان فاروقی، خط بنام غازی علم الدین، مشمولہ اردو معیار و استعمال، مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی، ص۲۳۵، ۲۳۸

۱۳۔ صابر لودھی، ڈاکٹر، بنام غازی علم الدین، مشمولہ اردو معیار و استعمال، مرتبہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی، ص۲۵۱

۱۴۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو زبان اور لسانیات، ص۳۲، ۵۶، ط لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

۱۵۔ روداد سیمینار، املا ور موز اوقاف کے مسائل، ص۱۲۳

۱۶۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر، جامع القواعد، ص۱۶۷، ۱۶۸، ط لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء

۱۷۔ سراج الدین علی خان آرزو، نوادر الفاظ، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، ص۳۷، ط کراچی، انجمن ترقیِ اردو پاکستان، ۱۹۹۲ء

۱۸۔ انشا اللہ خان انشا، سید، دریائے لطافت (مترجم پنڈت برج موہن دتاریہ کیفی) ص۱۶۱، ط کراچی، انجمن ترقیِ اردو، ۱۹۸۸ء

۱۹۔ روداد سیمینار، املا ور موز اوقاف کے مسائل، ص۱۲۸

۲۰۔ عبدالحق، مولوی، مقدمہ مشمولہ دریائے لطافت از انشا اللہ خان انشا، ص''ح، ط''

۲۱۔ شمس الرحمان فاروقی، لغاتِ روزمرہ، ص۲۱، ط کراچی، آج پبلشرز، ۲۰۱۲ء

۲۲۔ لغاتِ روزمرہ، ص۶۹

۲۳۔ لغاتِ روزمرہ، ص۶۹

۲۴۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، اردو املا: مسائل اور تجویزیں، مشمولہ اخبارِ اردو، ص۲۸، ط اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جلد۶، شمارہ۶، جون ۱۹۸۹ء

۲۵۔ طالب الہاشمی، اصلاح، تلفظ و املا، ص۲۱، ۱۹، ط لاہور، القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۴ء

۲۶۔ اصلاح، تلفظ و املا، ص۴۳

۲۷۔ آسی ضیائی، پروفیسر، درست اردو، ص۸۶، ط لاہور، ادارۂ معارفِ اسلامی، منصورہ، ستمبر ۲۰۱۳ء

۲۸۔ اقتدار حسین، ڈاکٹر، لسانیات کے بنیادی اصول، ص۱۳۴، ط علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۵ء

۲۹۔ خیال بخاری، سیّد، ہمارے لسانی مسائل (تلفظ_املا اور دسرے مسائل) ص ۱۳۲،ط لاہور، بساط الادب، ۱۹۹۵ء
۳۰۔ اردو زبان اور لسانیات، ص ۴۳
۳۱۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۷
۳۲۔ رشید حسن خاں، زبان اور قواعد، ص ۱۳، ط دہلی، ترقیِ اردو بورڈ، ۱۹۷۶ء
۳۳۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۹، ۱۴
۳۴۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۱۷، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۰
۳۵۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۱۶، ۳۱، ۳۰
۳۶۔ سلیمان ندوی، سید، نقوشِ سلیمانی، ص ۹۴، ط علی گڑھ، دارالمصنّفین، ۱۹۳۹ء
۳۷۔ اردو زبان اور لسانیات، ص ۴۴
۳۸۔ اردو زبان اور لسانیات، ص ۱۴۵، ۱۴۶
۳۹۔ سیف اللہ خالد، پروفیسر (دیباچہ) مشمولہ لسانی مطالعے، ص ۹
۴۰۔ عبدالستار دولوی، دوزبانیں، دوادب، ص ۱۳۷، ط بمبئی، دائرۃالادب، ۲۰۰۷ء
۴۱۔ لغاتِ روزمرہ، ص ۱۴۸
۴۲۔ روددادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص ۴
۴۳۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کا املا، مشمولہ روددادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص ۱۱۲، ۱۱۵۱۱۱
۴۴۔ شان الحق حقی، زبان کے معیار کا مسئلہ، ص ۵، مشمولہ اخبارِ اردو، ط اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، شمارہ ۶، ۵، جون ۲۰۱۴ء
۴۵۔ دوزبانیں دوادب، ص ۲۹۴
۴۶۔ زبان اور قواعد، ص ۸
۴۷۔ روددادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل مرتبہ اعجاز راہی، ص ۱۱۵
۴۸۔ شریف کنجاہی، پروفیسر، اردو میں عربی اور فارسی الفاظ کا املا (بحث) روددادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص ۱۲۲
۴۹۔ لسانی مطالعے، ص ۶۳

۵۰۔ رشید حسن خاں، اردو املا، ط دہلی، نیشنل اکادمی دریا گنج، ۱۹۷۴ء
۵۱۔ حفیظ الرحمان واصف، ادبی بھول بھلیاں، طبع دہلی، کلر پرنٹنگ پریس، بازار چتلی قبر، ۱۹۷۹ء
۵۲۔ گوپی چند نارنگ، املا نامہ، ط دہلی، ترقیِ اردو بورڈ، ۱۹۹۰ء
۵۳۔ سحر، ابو محمد، اردو املا اور اس کی اصلاح، ط بھوپال، مکتبہ ادب، ۱۹۸۲ء
۵۴۔ اعجاز راہی، مرتب، رودادِ سیمینار، املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ط اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
۵۵۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر، جامع القواعد، ط لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء
۵۶۔ دیبی پرشاد، رسالہ معیار الاملا، ط کان پور، مطبع نول کشور، ۱۹۹۷ء
۵۷۔ تصریحاتِ احسن مارہروی، مشمولہ جامع القواعد (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان) ط لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء
۵۸۔ تصریحات عبدالستار صدیقی، مشمولہ جامع القواعد (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان) ط لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء
۵۹۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو املا اور رسم الخط (اصول و مسائل) ط لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء
۶۰۔ تصریحات عبدالستار صدیقی، مشمولہ جامع القواعد، مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، ط لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳ء
۶۱۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۶۸
۶۲۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۶۹
۶۳۔ ادبی بھول بھلیاں، ص ۶۹
۶۴۔ املا نامہ، ۷۶
۶۵۔ لغاتِ روزمرہ، ص ۷۶
۶۶۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، صحافت کی زبان اور اردو املا کا انتشار، ماہنامہ مشمولہ قومی زبان، ص ۴۲، ۴۳، ۴۷، ط کراچی، انجمن ترقیِ اردو جلد ۸۸، شمارہ ۶، اپریل ۲۰۱۶ء
۶۷۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، صحتِ املا کے اصول، ص ۸، ط لاہور، ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی، ۲۰۰۹ء
۶۸۔ لسانی مطالعے، ص ۱۰۹
۶۹۔ شیر محمد زمان، گفتگو، مشمولہ مشمولہ رودادِ سیمینار املا و رموزِ اوقاف کے مسائل، ص ۱۳۲

۷۰۔ روودادِ سیمینار، املا ورموزِ اوقاف کے مسائل، ص۱۲۵

۷۱۔ اردو زبان اور لسانیات، ص۲۸

۷۲۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، طبع اول، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۲۴